

مصباح علی سند

میر لاج و لا

آپس میں ستم گستاہوئی بھنچ شعاعیں زمین پر
ایسے آری تھیں جیسے زمین پر افطاری کا سامن سجاہو۔
سڑک پر ہر چیز پھیلی جا رہی تھی۔ سوائے عمرایا کے اور
اس جھلساتے موسم میں وہ بہت تیز چل رہا تھا۔ ملی



مور، ہرن کی چال کا خوب تذکرہ سن رکھا ہو گا لیکن جناب! اس کی قطعاً ایسی چال نہیں تھی اور نہ ہی جیتے کی طرح بلکہ ہنر کھانے کے بعد سر ہٹ بھاگتے گدھے کے مشابہہ مزدور لگتا تھا۔

کچھ عرصہ سے اس میں ایک تبدیلی نمایاں تھی۔ چلتے چلتے جھک کر اپنی شلوار کا پانچویں ضرور چپک کرتا تھا۔ ایک دوبارہ یہی حرکت آفس میں کئی قریب بیٹھے کو لیک نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا ہوا بھائی۔ خیر تو ہے، پیٹ ٹھیک ہے آپ کا۔“

اب وہ کیا بتائے کہ زندگی کی روانی میں اکثر بد رنگی بلکہ دورنگی جراثیم پسینے کا اتفاق تو اکثر ہوا ہو گا، لیکن شلوار کا انسایدھا ہونا، کس قدر شرمساری کا باعث بنتا ہے، یہ صرف عمر ایذا ہی جان سکتا ہے۔ اب بھی اس نے تیز چلتے چلتے کوئی تیسری بار جھک کر شلوار کا پانچویں دکھا تھا اور جھکا سر جھکی کے مجھے سے جا ٹکرایا۔

”دوہو۔ میرے رباب!“ ہاتھ اور اٹھاتے اک کر رہا سی نکلی تھی۔ ایک تو یہ واڈ اپنا جی تو دیتا نہیں لیکن ناچا تیز تجاویزات کی طرح جا بجا تاروں سے بھرے مجھے ٹھونک رکھے ہیں۔ نشی دیر اس کی نگاہوں میں تارے اور کھکشا میں ناچتی رہیں۔ گنتا ہی اچھا ہوتا ان کی جگہ حیا چمک جاتی۔ خیر اس نے ماتھے پر ابھرے آنسو کو رگڑا اور دس حرف پیچھے ان تمام کی زندگیوں پر جنموں نے اس کی زندگی میں قیامت خیزیاں عمارتیں کھیں۔ وہ آج کل بے حد پریشان تھا۔ اپنی زندگی میں کچھ سکون ڈھونڈنے کے لیے نکلا تو اس نے کبھی لیا تھا لیکن میں باپ کے بعد اس کو شدت سے چاہنے والے ساتوں بہن بھائیوں نے ان دیکھی قسم اٹھائی۔

”ٹوکی تو نے اپنی مرضی سے پسند کی، نکاح اپنی مرضی سے کیا، لیکن ہم نے بھی ماں باپ کو آخر منہ

دکھانا ہے۔ چار لوگوں میں ہماری بھی کوئی عزت ہے۔ لوگ کیسا تھو تھو کر سن گئے، یمیم مسکین بھائی نے خود ہی بیادہ چالیا اب رخصتی ہوئی اور خوب دھوم دھڑکے

سے ہوئی اور ہماری ہی مرضی سے ہوئی۔“ وہ جپ ہو گیا تھا کیوں کہ حیا سے اس دن خاموش ملاقات کے تین چار دن بعد سب بہن بھائی اکٹھے ہو کر حیا کے گھر دھاوا بولنے گئے۔ سب نے دل کی خوب بھڑاس نکالی طعنے تشنہ دیے، گن کی سوئی غیرت جگائی۔

”ٹوکی ایسی ہی بھاری تھی، مانا ہمارا بھائی گدھا ہے، تم ہانک کر ہی لے گئے۔“ بڑی تپانے چھوٹی کے کٹو ماری، تیسرے نمبر والی نے منہ چڑھایا۔

”باگل ۴ نے گوبرا نہیں کتنا ٹوکی کو کہہ۔“ پیرلی آیا بوٹی ”۳“ ایسے تو نکاح ہی نہیں ہوتا، توہ قیامت ہی ہے۔“

دونوں بھانوجوں نے اپنی اپنی بارات کے سہمن گن دیے۔ بھائی جان نے جوش میں آکر کہا تھا۔ ”ہمارا بھائی شکل سے غریب لگتا ہے مگر بے نمبر اب ہم دھول ہاجے لائیں گے۔ تب ساتھ کرنا پانچ لڑکی۔“

سسر کی غیرت تو ایسی جاگی کہ دھالیں ڈال ڈال دوا فٹ اچھلی کہ!

”بچو عمر ایذا اب لا بارات اور سب بہن بھائیو! سے معافی منگوا، اگر حیا لے جاتی ہے، ۳ ایسے میں آیا بے چارہ بہن بھائیوں کو راضی کرنے میں لگا تھا۔



ان ظالم بہن بھائیوں سے کچھ رقم ہاکر بڑی مشکل سے بچت کی اور ایک موٹر سائیکل خرید لی تھی لیکن بس ٹائم کو اس کی تھی۔ ورنہ تو بھی بھائی جان۔ اڑتے کبھی بھیا اور اگر وہ دونوں اپنی سواریوں کو زحمت دے لیتے تو خیر سے بھاگے اب اتنے بڑے ہو چکے! کہ مانگتے ڈرانہ شراپے تھے انہیں جب بھی دا دیگ کا شوق کسی بھوت کی طرح چڑھتا، سب پہلے ان کے ابا پنا موٹر سائیکل مرمت کے خرچے۔

خوف سے چھپا دیتے پھر ایسے میں ایاز ماہوں ہی اٹے ہستی تھی، آڑے وقت میں کامر آنے والی۔

میں رہیں کاروبار کرنا ایک سنگ میل۔ اگر تو وہ دے دیتے
ہو تو ان کی دس نسلوں میں بیٹے پیدا ہونے جیسی
امانیں دیتے اور اگر کبھی ڈپٹ کر انکار کر دیتے آف پھر
نہ ہونے کیوں کہ ماموں بھی ایسے ہی واقع ہوئے تھے
ستائیس سالہ بھائیوں کے سامنے ہتھ کڑی لگے
نہرو کی طرح گردن گرائے جلتے تھے ان کے بچوں کے
سامنے سانپوں کے چرے کو ہولناک بنانے کے لیے چکی
پلوں والی آنکھوں کو پھاڑ لیتے، سوکھی غنمی جیسی
پایاں لٹک کر ڈانٹنا شروع (بڑی بھانجی اس قدر بدتمیز
تھی ڈرتا تو درکنار اپنی انگلی سے ان کی پسلیاں کھینچنے لگ
بالی اور کہتی۔

”ماموں کچھ ذمہ داری کریں، یہ والی اکڑ کر ٹوٹنے والی
ہے۔“ پھر کیا، سب بچوں کے قہقہے جھوٹ جاتے
تایاں مارتے، خود بھی ہنسنے اپنی الموں کو بھی ہنساتے۔
انے میں ماموں آگے پیچھے ہو جاتے اور جس کام
پیش آیا تھا۔ وہ واقعی نہ کرتے تھے بھانجے کون سا
کئے والے تھے۔ جب جب ماموں نے مونہ سا نیکیل
اپنے سے انکار کیا انہوں نے خاموشی سے جاتے جاتے
ڈیوڑھی میں کھڑی بایک کے ہاتھ پر کیل گاڑ دیا یا تیل کا
باپ کھینچ گئے۔

”چلو ہمارے کام کی نہیں تو کم از کم ایک دن ملا بھی
اے گدھے کی طرح گھسٹا مستری تک لے جائے
گا۔“

رات بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا تھا بلو بایک مانگنے
نیا۔ ماموں نے صبح۔ جلدی جانے کا کہہ کر انکار کر دیا۔
”کہینہ صفت جاتے جاتے پلگ کی تار کھینچ کر کاغذ
ازس کرواپس لگا گیا۔

”چل پھر اسے صبح لکھیں ہی مارتا رہیں۔ نہ
اپنے کی کچھ تو سزا ملے۔“ اور صبح جب اس نے لگ
داری تو وہ اشارت نہ ہو کر دے۔ زیادہ شور اس لیے نہ
اٹا کہ چھوٹی بھابھی کی لٹش ہنسن تیار یوں سے لگتا تھا
لیے جانے کی تیاریوں میں ہیں۔ اگر بھیا کو پتا چل گیا تو
بات اہل کہہ دیں گے۔

”وہاں! مستری تک بایک گھسٹا تو جائے گا ہی،
وہ میرے بچے بھی بٹھالے، ٹٹلی کے گھر تک تار دیتا۔“
اسے آج بینک جلدی پہنچنا تھا کیوں کہ ان دنوں
بینک کی کلوزنگ شروع ہو چکی تھی۔ بایک سے جانے
کا ارادہ ملتوی کر بس اسٹاپ کی جانب چل پڑا اور سر
پھوڑنے کے لیے کھبا جانے کیوں درمیان میں آگیا۔
وہ ماتھا سلاتا بس میں سوار ہو چکا تھا۔ موبائل چیک
کرنے کے لیے نکالا۔ اس کا ان باکس بری طرح سے
پھنسنے والا تھا۔

”عمر یاز، عمر یاز، عمر یاز۔“ اور پھر بہت سے
سوالیہ نشانات نے موبائل چیک کر رکھا تھا۔ اس نے
کھول کر دیکھا۔ چوتھے نمبر والی باجی کے پیغامات تھے۔
وہ علویا! ایسی ہی تھیں۔ بس کام کا سرسری خیال آ جاتا
ان کے حواسوں پر بے طرح جلاوی ہو جاتا تھا۔ ان کی
ان ہی حرکتوں سے تنگ آکر ان کے میاں نے خود کو
مستقل ہائیڈرین کا مریض ظاہر کر رکھا تھا تاکہ کچھ دیر تو
بیگم کی زبان بند ہو۔

جب وہ مسیح کرنے سے تنگ آ گئیں تو مس کل
پر مس کل دینا شروع کر دی۔ عمر یاز کو پتا تھا وہ کل پر
اپنا روپیہ تنگ نہیں لگائیں گی سو اسی نے کل ملا لی۔
حسب عادت سنسنی پھیلا دینے والی یہ بہن ہل
اٹھاتی ہی بدحواسوں کی طرح ہوتی تھی۔

”یاز! تجھے پتا ہے میں کل حقیق پھر مالک دکن کے
ساتھ چٹاوت کرنے گئے تھے۔“ ان دیکھے خوف سے
عمر یاز کی آنکھیں پھیل گئیں کیوں کہ معاملہ بہت
سیریس تھا مالک دکن ان کے میاں سے دکن خالی
کرانے کے چکر میں تھا۔ جب کہ آئینہ عینٹ کی بدت
پوری ہو جانے کے بلو جو حقیق بھائی پرانے کرائے دار
ہونے کی دھونس پر کسی صورت دکن چھوڑنے پر
راضی نہ تھے اور وہ بھی ان دنوں جب عید کا سیزن
شروع ہونے والا ہو۔ روز جھگڑا ہو رہا تھا۔ قریبی
دکانداروں کو اکٹھا کر کالم گلوچ کے ساتھ بات دست
کر رہاں تک پہنچ جاتی۔ عمر یاز کو اچھی طرح یاد تھا۔

آیا۔ ”بھولوں گی، کسی اور کی منتیں کر کے تو اپنا قیمتی وقت اپنے پاس رکھ، اپنی اس حیا، بے حیا کے لیے بچا کر۔“ وہ ابھی مزید صلواتیں سناتیں لیکن وہ عاجزی سے بولا تھا۔

”آپ ناراض نہ ہوں، میں واپسی پر آپ کی طرف آ جاؤں گا۔“

”اے۔۔۔ میرا بھائی کتنا اچھا ہے تو۔“ وہ کھڑے ہیر بدل گئیں۔ ”اللہ تیری زندگی رکھے، صحت مند رہی دے، تیری دے، خوشیوں دکھائے تجی کیا بتاؤں تجھے اما زاکتنی مشکلوں سے بے جوڑے ہیں۔ اب اگر عتیق دیکھ لیں، یقین کر فوراً ٹانگ لیں گے، مانتے تو انہیں کبھی شرم آئی ہی نہیں، پیالہ دے کر چوک میں بیچ دوں، شام تک ہزار دو ہزار جمع کر لائیں گے۔“ مسافروں کے خوف سے ایاز نے بمشکل ہنسی روکی مگر وہ پوری سنجیدگی سے اپنا دونا دہی نہیں۔

”پیروں کا تو انہیں ہر وقت دونا پڑا رہتا ہے، آج کل تو ویسے ہی دکان کی طرف سے بٹے پڑے ہیں۔ اظہار میں بھی کہتے ہیں رونا رکھ لو۔ لے لے تا، اب تو تیری شہولی پر بچوں کے آئے جوڑے بھی تو بنوانے ہیں، تجھے بھی کچھ دنا دلانا ہو گا، ورنہ تیری وہ حیا۔“ اب کے بے حیا انہوں نے دل میں کہا تھا ”جینے دے گی بھلا۔“ عمر ایاز چپ کر کے سنا رہا۔ ”اچھا پھر بتا آئے گا ناں تو۔ میں انتظار کروں گی۔“

”جی آ جاؤں گا۔“ یہ صرف عمر ایاز جانتا تھا کس دل سے اس نے اچھا جی کہا تھا۔



بس اسٹاپ پر رکی، باقی بینک تک کا راستہ اس نے پیدل طے کیا تھا۔ خیالوں میں بار بار حیا کے بچا جھلکے، روزے کی شدت اور باجی کی خود غرضی کٹنی حد تک کم کر چکے تھے۔ بینک میں سارا وقت بے حد مصروفیت کا گزرا، چھٹی سے کچھ پہلے حیا کا مسیج آیا۔

”مگر آپ فری ہیں تو آفس کے فون سے کل

دن پہلے عتیق بھائی کہہ رہے تھے۔“

”اس کے باب کا راج ہے، خلی کروا کے تو دکھائے، میں (گلی) اسے گولی مار دوں گا۔“ اس جھماکے کے ساتھ ہی ایاز کو اپنی سانس ڈھونڈنی ہوئی محسوس ہوئی تھی، کہیں بھائی نے ایسا کر تو نہیں دیا۔“ اس نے بہت ساری ہمت مجتمع کر کے پوچھا تھا۔

”باجی خیریت تو ہے، عتیق بھائی گھر ہی ہیں ناں؟“

”ہاں۔۔۔!!!“ باجی کے بھنے گلے اور زندناک سے نکلتی ایسبولنس جیسی ”آں“ پر وہ اندر تک کھس گیا۔ اس کاشتت سے جی چاہا کہ باجی کے گلے اور زندناک میں اتنی روٹی ٹھونس دے کہ ہمیشہ کے لیے ”تس“ بند ہو جائے اور کم از کم ایسی خطرناک باتیں سننے کو تو نہ ملیں جن سے دھچکے ہوئے جسم کا بجا ماندہ خون بھی نچڑ جاتا ہو۔ اس نے سچ ٹھونٹ نکل کر آہستگی سے پوچھا۔

”پھر مسئلہ کیا ہے؟“

”کیا مسئلہ ہو نا۔“ تباہل عارفانہ۔ ”کمیٹی کے میسے جوڑ رکے ہیں تو بینک جاتے ہوئے۔ آؤرا تپا کی طرف پکڑا تا جا۔“ ساتھ ہی وہ اونچی آواز میں برید میں۔ ”ایک تو تپا بھی قسم سے ایسی ہیں، کمیٹی ایک دن لیٹ ہو جائے تو سو رہے جرمانہ لگاتی ہیں، مجھے پورا یمن ہے، اپنی کمیٹی تو یوں ہی ٹھک جاتی ہوں گی۔“ چلا کو۔ اللہ بخشے اہل کما کرتی تھیں بڑی پھوپھی پر گھٹی ہیں تپا۔ ”اس سے پشتر کہ وہ مزید تپا کے ٹھکنے کے اونچے جھکنڈے بتاتیں وہ جلدی سے بولا تھا۔

”باجی! میں تو آج بس پر جا رہا ہوں۔ کل۔“

”ہاں ہاں بس۔“ اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ ”میں جب بھی کوئی کام کہہ دوں تو ڈھکا چھپا انکار کر دیا کر، صاف کہہ دے میرا کام کرتے موت پڑتی ہے۔ تپا کے اسکول کا تو چوکیدار تک بن جاتا ہے۔ بھائی جان کے گھر کا محراب دھونے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، تجھے ہر کسی کے آگے پیچھے منتیں کرتا پھرتا ہے، تیری رخصتی کروا دیں، میری دفعہ انکار ہے۔ اچھا بس ٹھیک ہے۔“ وہی ان کا لٹھ مار انداز عود کر

ایک دوسرے کے بل فوج فوج ٹنڈ کر دیں۔“
 ”اچھا ہے تاہم ابھی۔“ پھولی والی نے مستی میں بڑی
 والی کو ٹھوکار مارا ”جوئی نہیں اور بیٹ خرید رکھے ہیں۔
 بالوں میں انکائے کو، کیلوں سے ٹنڈ پر ٹھونکیں گی برات
 پر ہی ہی ہی۔“

پھر ٹنڈ پر ٹھونکیں پنوں کی لطافت نے موسم کی
 حدت کو قدرے کم کر دیا تھا۔ ننوں اور ان کے بچوں
 لعنتیں بھیج اپنے اپنے مہمانوں کی لسٹ عمریاز کو
 پکڑائی۔ ایاز بھی ایسے میں کیا کرنا کسی بہن بھائی
 بھلوج کو ناراض کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔
 کیوں کہ صورت حال خاصی تشویش ناک ہو چکی تھی۔
 سر صاحب نے ضد پکڑ رکھی تھی۔

”جب تک تیرے بہن بھائی راضی خوشی نہ آئیں
 گے، جیائیں دول گاہ۔“

اب بہن بھائیوں کو راضی خوشی کرنے میں بیچارہ
 خود محلے کے بھنگی خوش بخت سے ملنے لگ گیا تھا۔
 بینک میں بیٹھا وہ بھنگی تمام سرسٹیں چرے پر
 سجائے خیالوں میں جیا کے لیوں سے سرخ پھول
 جھڑتے دیکھ رہا تھا۔ آواز میں تمام نری اتار کر بولا تھا۔
 ”کیا فرماری تھیں آپ۔“

”کیا بات ہے روزے میں آپ کے کالوں نے کلام
 کرنا چھوڑ دیا ہے۔“ وہ صرف مسکرایا۔
 ”میں کہہ رہی تھی اب ای بھی ناراض ہو رہی ہیں،
 بتلا دیجئے آخر خفا کیوں ہیں۔“

”ارے نہیں نہیں، کیسی باتیں کرتیں ہیں آپ
 میں اور آپ سے خفا۔ ان شاء اللہ بج شام کو سر کے
 بل حاضر ہو جاؤں گا۔“ اس کے جیلے پر حیانے جاندار
 قہقہہ مارا۔ ایاز کے دل میں جلتے تک گھٹینیں بن گئیں۔
 سانولا رنگ گرم تانبے کی طرح جلنے لگا۔

”خدارا“ سر کے بل مت آئے گا، لوگ مداری
 سمجھ کر رستہ نہ دیں گے، اور افطار کا وقت کرتب
 دکھانے میں گزر جائے گا۔“ اس کی حس مزاج پر کنزور
 دل میں چوہے بلیاں دھاچہ کڑی چانے لگے۔ ”اللہ
 حافظ“ کہتے ہوئے فون بند کیا۔ ”پناہست خیال رکھیے

رہیں۔“ حیا کے لیے تو عمریاز دل و جان سے فری
 تھا۔ اک نظر دیکھنے کے لیے بے چین، آواز سننے کے
 لیے بے تاب۔ ”اپنے بے قرار دل کو قرار دینے کے
 لیے آفس کا فون کیوں اپنا برسل استعمال کرے گا بھلا
 وہ صرف بہن بھائیوں کی جھینٹیں جھیلنے کے لیے ہی
 تھوڑا جب میں ڈال رکھا ہے۔ اس نے فوراً کل
 مائی۔ سوچی پسلیوں میں دھڑ دھڑکتے دل کے
 ساتھ اس کا دل احوال پوچھا۔

”خیریت جی جی، کیسی ہیں آپ؟“
 ”میں تو اللہ کی کرم نوازی سے بالکل ٹھیک ہوں،
 بس آپ ہی کے مزاج میں ملتے۔“
 ”ارے یہ کیا کہہ دیا آپ نے۔ حکم کریں
 آپ۔“

وہ قدرے اٹھلاتی پھر دبا دبا سا غصہ کرتی، کہنے لگی۔
 ”ای کب سے آپ کو افطار پر بلاری ہیں، آپ ٹالے
 ہی جا رہے ہیں۔ کل تیرا غشو بھی شروع ہو جائے
 گا۔ مگر آپ ہیں کہ۔“ سنتے ہی ایک غمزہ آہ
 پسلیوں میں اٹک گئی۔ دراصل اس کی سانس نے اسے
 کئی بار افطار کے لیے فون کیے مگر قسمت کے چکر ایسے
 تھے سوخت تو اس کے پاس تھا مگر صرف بہن بھائیوں
 کے گلے دار کرنے کے لیے۔ کتنی بار ارادہ کیا، مگر بھی
 نہ آ کوئی پن گیا، کبھی لباس، کبھی ہائیک عاتب ہے تو
 کبھی سارے بہن بھائیوں کا اجلاس بیٹھ جاتا۔ مسئلہ
 عمریاز کی شادی کا معاملہ دیکھنے کا تھا۔ اور اجلاس بھی
 ایسا تھا جس میں ان ساتوں کے اکیس بد تمیز بچوں پر عمر
 ایاز کی ڈوبی ہوئی تھی۔

”وہ حیان رکھ نہیں پھرتیں نہ۔“ کیوں کہ بہنوں کو
 اٹھتے ہوتے ہی سرسٹل کے رونے، رونے کا موقع ملتا
 اور بھابھیاں اس رش کو دیکھ کر اندر تک جلتی
 بھستیں۔ آگے پیچھے کتنی بار دونوں بھابھیوں کو کھسر
 پھسر کرتے سنا گیا تھا۔

”جس دن گرمی زیادہ ہو گئے مگر کے کاموں سے
 نہ لڑ، کم بختیں آجاتی ہیں انہی ہو کر، بھائی کی بری
 بان کرنے۔ کو لڑ کے آگے ایسی بڑی ہیں، خواہ بچے

سب لہل کے ساتھ تھیں۔ اور پھر پلا خراٹے ساول
میں جہاں ہر جہہ ناظم گیا تھا لہل کی ناراضی رنگ لے
تھی۔

عافین حسن مان گیا تھا شادی کے لیے۔ میں
بٹیوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اور عافین حسن کو
ٹھکانہ نہیں مل رہا تھا جہاں اپنے دل کی تمام اواسی اور
ویرانی نکال کر رکھتا۔



”سعدیہ کی نند کا دہور ہے نا حسیب۔ وی جو
کارڈیو لوجسٹ ہے۔ پانچ سال شادی رہی۔ اولاد نہ
ہوئی بیوی بھی فوت ہو گئی۔ دو سال ہو گئے اسے دنیا
سے گئے پہلے تو شادی کے لیے ہاتا نہیں تھا۔ اب
مان گیا ہے اور اس نے خود گھر والوں سے کہا ہے کہ
تمہارے لیے بات کریں۔ شادی کے بعد انگلینڈ
شفٹ ہونے کا ارادہ ہے اس کا۔ اگر تمہاں جاؤ تو رشتہ
سمجھ میں آتا ہے۔ میں ملی ہوں اس سے کئی بار بہت
اجھا مہذب ہے۔ عمول میں بھی دو دنوں کے زیادہ
فرق نہیں۔ مناسب رشتہ ہے سوچ لو بیٹا۔“ آئرن
اسٹینڈ کے سامنے کھڑی قاریہ نے لہل کی پوری بات
سنی۔ پھر محل سے بولی۔

”لہل! آپ سے سختی بار کہا ہے کہ مجھے شادی
نہیں کرنی۔ تو نہیں کرنی۔ اور ضروری نہیں ہے
لہل شادی کرنا۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں اور
میں شادی کے بغیر اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔“
”دیکھو قاریہ! اب تو تلوہ کے رشتے بھی آنے
شروع ہو گئے مگر میں تمہاری شادی پہلے کرنا چاہتی
ہوں۔ ابھی زندگی اچھی گزر رہی ہے۔ مگر کچھ سال
گزر رہے تو پچھتاؤ گی۔ ٹھیک ہے ہم بر سر روزگار ہو
کسی کی محتاج نہیں ہو۔ مگر تم عورت ذات ہو قاریہ!
سر پہ باپ نہیں رہا۔ کوئی بھائی نہیں ہے۔ اور عورت
جتنی بھی اشوگ اور با اثر ہو اس معاشرے میں بلو قار
زندگی کے لیے اس کے نام کے آگے کسی مو کا نام ہونا
ضروری ہے۔ ایسا موجود اس زندگی میں اس کا سابقہ
ہو۔

احمد سے کہا۔

”فرح کاٹھ میں رہو۔ بیٹوں کے لیے ایسے بے
دھڑک ہو کر بات نہیں کرتے۔“ بیٹی خالہ نے ڈانٹ
دیا مگر جھوٹی فرح کے ساتھ تھیں۔

اگلے دو سالوں میں وہ بینک میں منجری پوسٹ پر آ
گیا۔ معیار زندگی میں بھی تبدیلی آئی۔ اب یہ گھر چلی
پچ کر انہوں نے مزید بڑا گھر لیا۔ تقریباً ڈیڑھ کنل پر
مستقل یہ بنگلہ ان سب کی خواہشوں سے بھر کر تھا۔
خاندان بھر میں اس کی تعریف ہوتی تھی۔ کئی بیٹیوں
والے خود منہ سے رشتہ دے رہے تھے۔ امیر گھرانوں
سے بھی رشتے آرہے تھے۔ مگر اس کی ”نہ اپنی جگہ
برقرار تھی۔

اتنا بڑا گھر۔ لہل بولائی بولائی پھر تھیں۔ جاگتی
آنکھوں سے پوتے پوتیوں کے خواب دیکھتیں۔ ان

کے لیے ابھی سے گھر میں جھولے لگوا رہی تھیں۔ مگر
حقیقت میں دور دور تک ان کا آتا نہیں تھا۔ بیٹیوں کو
بلا تھیں اور خوب سخت ستا تھیں۔

”کیسی بے نیس ہو ایک بھائی۔ شادی کے لیے
رضامند نہیں کر سکتیں۔ بس اپنے اپنے گھروں کی فکر
ہے۔ بھائی کی پرواہ نہیں اس کی زندگی میں بھی رونق
آجائے۔ کتنی حسرت ہے مجھے اس کے بچوں کے لاڈ
اٹھانے کی۔“

”لہل! ہم تو ہر طرح بھائی کو قائل کرتے رہے اب
وہی نہ مانے تو ہم کیا روکتی کر سکتے ہیں؟“
”آپ مل ہو کے زبردستی نہیں کر سکتیں ہم تو پھر
بہنیں ہیں۔“ درمیان والی سدرہ نے کہا۔

”اچھا یہ بات ہے تو اب میں بھی بتاتی ہوں تم لوگوں
کو۔ میرا بیٹا مل کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اب ہو گا
دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ اب میں اسے جوان بنانا سمجھ
کر منتیں نہیں کروں گی بلکہ ایسی ناراضی دکھاؤں گی کہ
چھوٹے بچے کی طرح مجھے منائے گا اور دیکھتی رہو تم
لوگ! ہم عید پر تم لوگوں کی بھابھی ضرور ہو گی۔ نہیں
تو ہم میں کوئی عید نہیں منائے گا یہ طے کر لو۔“ لہل
نے اس دن پکا تہیہ کر لیا اور بیٹیوں کو بھی بلور کروا دیا۔

اے! میں اپنی ذات کے ساتھ خوش ہوں۔ اگر مجھے لگا کہ میری ذات کسی ساتھی کی ضرورت مند ہے تو میں ضرور شادی کر لوں گی۔ بس آپ مجھے مجبور نہ کریں۔“ وہ ہم لہجے میں بول رہی تھی۔
اے! نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔



تینو سال بیت گئے تھے۔ تینو سالوں میں حالات بدلے اور بہت کچھ بدلا۔ مگر اس کے دل پہ اداسی اور یادوں کا موسم ٹھہر سا گیا تھا۔
یہ بات سچ تھی کہ اے! نے نہ کوئی شکوہ تھا نہ شکایت۔ نہ ہی وہ کبھی اس وجہ سے اے! سے خائف ہوئی تھی کہ عافین سے پھرنے کا موجب اے! ہی

تھیں۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کے دل میں عافین کی محبت اس کی یاد روز اول کی طرح تازہ دم تھی۔ تینو سالوں میں اس کے بارے میں اک ذرا سی خبر بھی نہیں ملی تھی کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اسے بھول گیا یا کبھی کبھار یاد کر لیتا ہے۔ مگر سال یا آج تک اسی عہد سے بندھا ہے۔ اس کی طرح اکیلا ہے۔ کچھ خبر نہیں تھی اس کے بارے میں پھر بھی۔ وہ اسی کی یادوں سے اپنے اندر کی دنیا آبلو کیے ہوئے تھی اور انتظار میں تھی۔ یہ انتظار لا حاصل تھا یا اس کا کچھ حاصل تھا؟ وہ اس بات سے بے پروا تھی۔ اسے تو جانتے سے کا منتظر تھا۔

وہ بچوں سے کچھ نہیں بولا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں کہہ گئی تھیں کہ کبھی نہ کبھی اسی کی طرف پلے گا اور وہ آج تک ان نگاہوں کے عہد سے بندھی زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے پلٹ آنے کی امید دل میں پوری تو اٹلی سے زندہ تھی۔ فاریہ کو اللہ سے امید تھی۔ اللہ پر یقین تھا اسی لیے تو اس کی امید نے کبھی دم نہیں توڑا تھا۔



تم بہنوں کا خیال رکھتی ہو۔ بھانجے بھانجیوں کو تم سے اسیت ہے۔ مگر یہ رشتے جتنے بھی اچھے ہوں زندگی کے ساتھی کا کردار نہیں نبھا سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کا جوڑ دیا ہے۔ کوئی حکمت ہے تو بتایا ہے۔ تاکہ دیکھ میری بچی! اپنی ضد چھوڑ اور عقل سے فیصلہ کر۔“ کہیں کے لہجے میں پیار بھری منت تھی۔
”اے! یہ باتیں آپ کئی بار کہہ چکی ہیں۔ کبھی اثر نہیں ہوا مجھ پر تو پھر کیوں ہر بار نئے سرے سے دہرائی ہیں۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔ مجھے کسی ساتھی کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اب نادیدہ کے بارے میں سوچیں۔“ وہ کچھ بے زاری سے بولی۔ ہر بات آرام پارے کرنے والی فاریہ شادی کے ذکر پر پونہ ہی چڑی جاتی تھی۔

”تم آج تک اس بات کو بھولی نہیں ہو فاریہ۔ میں سے بدلہ لے رہی ہو نا۔ میں نے اس وقت تمہارے ارمانوں، تمہارے خوابوں، تمہارے دل کی پرواہ نہیں کی اور تم آج تک۔“ وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پائیں۔ فاریہ استری چھوڑ کر لپک کر ان کے قریب آ گئی۔

”اے! آپ نے ایسا سوچا بھی کیوں۔ کوئی بیٹی میں سے بھی بدلہ لے سکتی ہے۔ میں ایسا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں باپ کا حق ہوتا ہے اولاد پر۔ اور میں باپ کو جانتے ہیں، سمجھتے ہیں۔ ضروری نہیں وہ سب اولاد بھی سمجھے۔ آپ نے میرے ساتھ کچھ برا نہیں کیا اے!۔ بلکہ اچھا ہی کیا۔ ایک میں اپنی بیٹی کو کسی بھی طرح سمجھانے کا حق رکھتی ہے۔ کیونکہ میں کبھی برا نہیں چاہتی۔ اور میں انتہائی جانتی ہوں کہ آپ نے کبھی میرا برا نہیں چاہا۔ نہ برا کیا۔ جو ان بیٹی کسی غیر موصے پیار کا رشتہ جوڑ دیتے تو اچھی اور سمجھ دار میں اسے ایسے ہی سمجھائے گی۔

میں ہونے کے ناتے آپ نے ٹھیک کیا تھا۔ اگر آپ میری شادی کا بھوت سر سے اتار دیں تو آپ کو بالکل نہ ملے کہ میں آپ سے بدلہ لے رہی ہوں۔

تیرے لیے آلو بخارے کا شربت بنا کر رکھوں گی افطار میں پینا ٹھنڈک ملے گی۔ کیسا کھلا گیا میرا بھائی۔“ کہتے ہوئے اسے کمرے کی جانب بڑھیں۔ کچھ دیر بعد ہزار ہزار کے نیلے نوٹ گنتی ہوئی آئیں اور ساتھ اسے کہہ بھی رہی تھیں۔

”ایاز! جب تبا کو یہ دینے جائے گا، ان سے ان کا عید والا سوٹ لے لیتا، کل جب تو شربت لینے آئے گا میری طرف تو وہ بھی لیتے آتا، میں سوچ رہی ہوں تیری رخصتی پر ویسا ہی ڈیزائن بنالوں۔ تبا تیرے بھی کہ نیا ڈیزائن بنوایا ہے انہوں نے۔“ پہلے تو لفظ ”تیری رخصتی“ پر منہ کڑوا ہوا، پھر آلو بخارے کے شربت کی مہمانی نے ٹھنڈک کی جگہ آگ بھڑی، وہ بولا تو کچھ نہیں بے چارگی سے دھماکا رہا۔ باقی نے نوٹ گن کر اس کی جانب بڑھائے اور ساتھ تنبیہ بھی کی۔

”بے سامنے تبا سے گوانا، پورے دس ہزار ہیں۔ کسیں کہہ دیں، آٹھ تھے، پانچ تھے۔ بس اب کیا بتاؤں تبا کی ڈنڈی بار علوت کا۔“ عمر ایاز ان کی باتوں سے اندر تک جل بھٹن گیا تھا۔ اگر منہ سے ایک حرف بھی بول دیتا تو وہ ایسے ایسے راز اٹھتے کہ بندہ اپنے آپ سے شرماتا۔ اس نے بنا کچھ کئے، ہاتھ آگے بڑھایا، رقم جیب میں اڑتے ہوئے نکلنے کی جلدی کی۔ لمبے بعد ہی باقی نے کئی آوازیں دیں۔

”ایاز بات سن، ایاز، ایاز۔“ اس نے تیز قدموں سے آگے بڑھتے ہر آواز سنی سنی کر دی۔ اور کھلی کانکڑ پار کر لیا۔



وہ تیزی سے بس سے اترا، تبا کے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا کہ جلدی سے تبا کے پہنچے، پھرتیار ہو اور پھر حیا کے گھر جائے۔ آدھے راستے میں اسے تازہ آلو بخاروں سے سجی ریزمی دکھائی دی۔ ان واحد میں حیا یاد آئی۔ افطار پر اس کی جانب جانا تو تھا ہی، خالی ہاتھ جانے سے بہتر ہے کوئی فروٹ لے لیا جائے۔ اس نے اچھے اچھے آلو بخارے چھانٹ کر وزن کر لیا۔ رقم ادا

کرنے کے لیے انا والٹ نکالا۔ پیسے گنتے ہوئے اسے باقی کی کمپنی کا مکمل گزرا۔ وہ جیب میں نہیں تھی۔ اس نے اچھی طرح جیب ٹٹولی۔ آگے کی پیچھے کی۔ سب کچھ تھا مگر کمپنی کاغذ۔ اس کا رنگ اڑ گیا۔ اس کی بدحواسی دیکھ کر ریزمی والے نے بھی پوچھا۔

”دو بھائی کیا ہوا۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔۔۔“ مکمل کے آلو بخارے، مکمل کی افطاری اسے تو کمپنی کی بڑگنی تھی۔ باقی ایسی تو نہ تھیں وہ اسے آسانی سے بخش دیتیں۔ سننے ہی انہیں تو غش پڑ جاتا تھا۔ اکثر وہ شتر وہ اپنی نام نہاد غروت کے ایسے قصے سناتی تھیں کہ سننے والا انہیں چپ کروانے کے لیے اپنی جیب سے رقم نکل کر تھما دیتا تھا۔

”بس تو اپنا پورا کر لے، ہماری خیر ہے۔“ اب تو یہ دس ہزار کی کمپنی کا معاملہ تھا، اگر محکمہ بھی پڑگنی۔ وہ تو آگلی سال نہیں لیں گی۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ رخصتی سر پر ہے۔ پریشانی کے عالم میں وہ اپنے قدموں مڑا۔ ریزمی والا بھی روزے سے تھا۔ چلا کر بولا۔

”کم بخت تو چھانٹ تو ایسے رہا تھا۔ جیسے کسی وزیر اعظم کو پیش کرتے ہیں، پیسے سننے ہی دم نکل گیا۔“ اس نے اپنا شمار دو بارہ ریزمی پر الٹ لیا تھا۔ وہ گردن جھکائے دوبار سارے رستے پر چلا تھا۔ کہیں رقم گری ہوئی مل جائے، اگر وہ وہاں گری ہوتی تب بھی نہ ملتی، کوئی راہ گیر اٹھا کر چلا بننا۔ اس نے صدے میں سارا وقت گزرا، آگلی صبح اپنی تنخواہ سے تبا کو کمپنی بتا بتائے بھڑی۔ اگلے دن بینک میں بیٹھا تھا جب باقی کا کئی بار

مسج آیا۔

”ایاز! تجھ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے بالکل توجہ نہیں دی، ان کا پہلا ضروری کام دس ہزار میں بھگتا تھا۔ مزید اس میں ہمت نہیں تھی۔ لیکن پھر باقی کی کل ہی آئی۔ جانے کس حاتم طائی کا بیجا کھال تھا۔ آج وہ مسئلہ کل کے بجائے باقاعدہ فون کر رہی تھیں۔ اس نے اٹھایا لیا۔

”جی، جی۔۔۔“

”توبہ ہے کل سے تجھے مسیح کر رہی ہوں، مجھل ہے جو جواب دے دے۔ وہ کہتی۔ ”وہ درمیان میں بات کاٹ کر تنگ کر دیا۔

ہاں ہاں دے آیا ہوں۔ پورے دس ہزار تھے۔ کیا کو اپنے سامنے گوائے تھے۔

”آئیں۔“ بائی کے بند ٹاک سے ہوٹر بجلا۔ سچ بتا تو دے کیا۔

”کیا اب لکھ کر دوں۔“ وہ چڑھی ہو گیا۔ پورے دس ہزار کا صدر تھا۔

”جھل پھر ٹھیک ہے بھیا۔“ بائی نو معنی کتے زور سے نہیں۔ ”کل تیرے جانے کے بعد اللہ کی زمین سے مجھے دس ہزار ملے تھے۔“ سنتے ہوئے خوشی سے ایاز کی آنکھیں پھٹ گئیں لیکن بائی کے اگلے جملے نے اُلک لگادی تھی۔

”کتنی تواب تو نے بھری دی، ان دس ہزار کے تیری شادی پر اچھے سے جوڑے بنواؤں گی، ویسے تو“

تجھ کو اس نے دیئے نہیں تھے، اللہ نے ہی تیری جیب سے گردا دیئے۔“

کہتے ہی گھٹاک سے بائی کا فون بند ہو گیا اور کتنی دیر وہ بند فون پر بائی کو کوستا رہا۔

آج اس کا پکا ارادہ تھا افطار حیا کے گھر پر کرے گا۔ بلکہ اچانک جا کر انہیں سر پرانز دے کر خوش کر دے گا۔ تیار ہونے کے لیے گھر کے راستے پر تھا جب بڑی آبا کی کھل آئی۔ لمبے بھر کو اس کا دل مٹھی میں سمٹ گیا۔ دو چار دماغ میں بڑھ کر فون پر پھونٹیں۔ آگے کون سا اس کی دعا میں قبول ہوئی تھیں۔ اوپر جانے سے پہلے ہی کوئی نہ کوئی بن بھائی ہاتھ بڑھا کر اپنی جیب میں ڈال لیتا تھا کہ ابھی مناسب وقت نہیں۔ عمر ایاز تو بچہ ہے۔ ایسے ہی بالنگتا رہتا ہے۔ اس نے بدلی سے فون کان سے لگایا تھا۔

”ہاں ایاز، کھل ہے تو۔“

”گھر جا رہا ہوں، وہ دہرایا بولا۔“

”جھل میرا بچہ، جلدی سے میری طرف آ جا۔ ایک کام آن پڑا ہے تجھ سے۔“ اس کی سیاہ آنکھیں پوری طرح روشن ہو گئیں۔ تپا لگی لپٹی رکھنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ نہ بھی منٹنا میں نہ تمید باندھی۔ جو کام ہے صاف زور دے کر کہہ دیا۔

”یہ تجھے ہی کرنا ہے، اگر نہیں کرنا، ابھی کہ ابھی بتا دے۔“ پھر بھلا عمر ایاز کی جرات تھی کہ کچھ بول پاتا۔ بس سر ہلاتا ”جی جی۔ ضرور“ کہے جاتا۔ اب بھی بے دلی سے مسکرا کر دروازہ بجایا۔ تپانے ہی کھولا تھا۔

ساتھ ہی اندر لے گئیں۔

”آ جا بیٹھ جا۔“ ایاز کو لڑکے آگے اس کی کرسی رکھ دی۔ قریب ہی کھانے کی میز پر کچھ سالن بندھا تھا۔ ایک ٹفن، چھوٹا سا پانی کا کولر، ایک شاور میں تولیہ جائے نماز، چادر جھانک رہی تھی۔ عمر ایاز کو کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ تپانے ایک کرسی چھپتی اور اس کے سامنے رکھی۔ گری اس قدر تھی کہ کھٹے میں دھنسا پڑا کھینچ کر بیٹر پر چٹا اور ٹائلیں لمبی کرتے ہوئے بیڈ کی پائنٹی پر نکالیں۔

”کیا قیامت بچاتی گری ہے۔ توبہ۔“ منہ پر ہاتھ پھیر کر پسینہ پونچھا۔ اور گویا ہو میں۔

”بلو تیرا کتنی دیر انتظار کرنا رہا۔ مسجد چھوڑنے ماموں جائیں گے۔ پر ماموں کا تو کوئی اتنا پتا ہی نہیں، پھر اس کے دوست اور ابو ہی جا کر چھوڑ آئے۔ دیر ہو رہی تھی میں، معصوم ہاں جا کر ہی بڑھتی تھی۔“

”چھا ماشاء اللہ، وہ چلا گیا۔“ ایاز سپاٹ سا مسکرایا تھا۔

”تو اور کیا، تیرا کب تک انتظار کرتا۔“ تپانے پہلو بدل کر کمر کی دوسری جانب ٹھنڈی ہوا لگوائی۔ ”اب اس طرح ہے، تو اس سے جا کر مل بھی آ، اور افطاری بھی لے جا۔ اور ہاں روزانہ سحری افطاری تو ہی دے کر آئے گا۔“

عمر ایاز سنتے ہی یک لخت سن سا رہ گیا۔ ”یعنی کہ دس دن۔“

میں سے جان چھڑا مسجد جا رہا تھا۔ آپا اتنا ہی اسے لپٹا لپٹا کر روٹی پار کر رہی تھیں۔
 ”تھکے ان کی ضرورت بالکل نہیں ہے، پریشان نہیں ہونا“ اکیلا نہیں ہو گا تو وہیں، ایاز سے کہہ دوں گی، وہ مسجد کے صحن میں سو جائے گا۔ دن میں بھی چکر لگاتا رہے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو اسے بتا دیتا۔“ وہ فراتہرواری سے سر ہلاتا رہا۔ اب کی بار بھی یہی سب کچھ ہوتا تھا۔ اس نے دس دن اعتکاف کیا۔ اور عمر ایاز نے سحر و انظار پہنچانے کے ساتھ ساتھ دس راتوں تک اس کا پرہودیا۔



حیا اس سے بری طرح ناراض ہو چکی تھی۔ کتنی بار انظار پر بلایا مگر وہ آکے نہ دیا۔ ایسی بھی کیا ہے مولیٰ، اتنا تو حسین بھی نہیں، نہ ہی کوئی بہت ٹھٹھ کی نوکری ہے جو غرور آگیا۔ اس کا دل ویسے بھی خدشوں سے بری طرح نیرو آنا تھا۔
 ”جائے معاملہ کیا ہے، جو آکر نہیں دیتے۔“ عید سے دوسرے دن رخصتی طے تھی۔ اب ہاتھیں بہن بھائی آتے بھی ہیں یا نہیں۔ اور اب میاں نے عجب ضد لگائی تھی۔ نکاح کرتے مل نہ لگایا تھا۔ اب رخصتی پر سلطان راہی بن کر بیٹھ گئے۔ اگر بارات میں بہن بھائی نہ آئے حیا نہیں ملے گی، آخر کو بے عزتی کر کے گئے تھے۔ آخری روزے والے دن اس نے عمر ایاز کو کل کر کے بتایا تھا۔

”آپا بہت ناراض ہیں۔ آپ بتا دیجئے“ آپ کے بہن بھائی آرہے ہیں یا نہیں۔“
 ”ہاں ہاں ملی ڈیرے۔“ وہ لہک کر بولا تھا۔ ”میں نے سب کو راضی کر لیا ہے، آپ پریشان مت ہوں، آئیں گے بھی اور کرشتہ رویے کی معافی بھی مانگیں گے۔“ حیا کے چہرے پر حیا کی ساری سرخی دوڑ گئی۔ وہ ابھی بھی اپنی رسیکی آواز میں دس گھولے جا رہا تھا۔
 ”رات کو چاند رات ہے، آپ تیار رہیے گا“ شاپنگ پر لے چلوں گا۔“

پچھلے سال سے آپا کے بلو کو عجیب خبط چڑھا تھا۔ سارا سال نماز نہیں پڑھی، قرآن پاک کبھی کھول کر نہ دیکھا، دو جتنے چھوڑ کر تیسرے کی باری اب پھٹ مارتے لے جاتے تھے۔

”بد بختوں اسلام سے خارج نہ ہو جانا۔“ لیکن جیسے ہی رمضان المبارک آتا۔ اعتکاف مبلغ میں سا جاتا۔ بلو نے اپنے کسی دوست سے سنا تھا۔ اس نے بورڈ میں ٹاپ کیا ہے، پورے دس دن کے اعتکاف میں بیٹھ کر دو روزہ عمارتیں بنائی تھیں۔

بڑی آپا کے بچوں کی ذہانت پورے خاندان میں مشہور تھی۔ اسی حسرت کو ————— بلو اعتکاف

میں بیٹھ کر برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ ایک وجہ دس دن ایلی ایلی کی ڈانٹ پھنکار اور دیگر کاموں سے خلاصی ملے گی، خدمت کے لیے ماموں، دل کھول کو آرام کروں گا اور پھر سارے خاندان میں عزت الگ۔ ہر کوئی اپنی دعاؤں کا پرچا تھا ملے آپا۔ سب آکٹھے ہو کر پھولوں کا ہار ڈال مسجد چھوڑنے گئے۔ چاند نکلنے پر پھولوں میں ملا کر لینے گئے۔ ماتھا چوبہ۔ نوٹ سمجھائے۔ اچھی خاصی عیدی مل گئی تھی۔ اب یہ صرف اللہ جانے یا وہ خود ہی اس نے کتنی عبادت کی تھی۔ کتنی پرہیزگاری دکھائی۔ کیوں کہ دو دن پہلے ماموں سے پیسے مانگ کر اپنا موبائل ٹھیک کروایا تھا اور پانچ سو کا نوڈ بھی کروا تا دیکھا گیا تھا۔

سحر و انظار کی ڈیوٹی سن کر عمر ایاز کا چہرہ سن ہوتے ہوتے منجمد ہو گیا۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکا کہ آپ یہ کام مسجد بھائی کے ذمہ لگا دیں۔ کیوں کہ وہ بہت اچھی طرح سے اپنے مولوی نما، ہنونی کو جانتا تھا۔ جتنا دن بھر محنت مشقت کے ساتھ نمازیں، قرآن پڑھتے تھے۔ اتنی ہی مشکل سے اس وقت آنکھ کھلتی جب سحر ختم ہونے کے اعلانات شروع ہوتے۔ اکثر تو وہ ہوڑ کے وقت دانتوں کا خدال کرتے بائے جاتے۔ وہ خود وقت پر روزہ رکھ لیں تو بڑی بات تھی۔ چہ جائیکہ بچے کو مسجد تک سحر و انظار پہنچائیں۔ اور بلو کا صرف سحر و انظار کا ہی مسئلہ نہیں تھا۔ جسے شوق و جذبے سے بچہ بہلورنا

فون بند ہونے کے بعد ادھر حیاتنگ کی لست بنائے، آخری روزہ گزار رہی تھی ادھر عمر ایاز نے پلان بنایا کیا کیا، کھل کھل سے لے کر دیتا ہے، کیا کھانا ہے۔ چوڑی مندی تو اپنے ہاتھوں سے اس کے نازک ہاتھوں پر سجاوٹ لگا۔ مصنفہ آپا کے توسط سے جو روٹوئی جھلے یاد ہوئے تھے سب دہراتے ہوئے اسے شرم سے جھرجھری آگئی۔



تو قارئین چاند نظر آیا ہی چاہتا ہے۔ جہاں عمر ایاز کے من میں گل بوئے پھوٹنے کا وقت قریب تھا وہاں ہر طرف پٹائے، بچے، شور شرابا، دھوم دھڑکا شروع۔ سب بہن بھائی بڑی تپا کے گھر ٹوٹ پڑے۔ مبارکی سلاستی۔ بلو کا ہاتھ چوم، مچھے دے اپنی اپنی دعاؤں کا پوچھ رہے تھے۔ دوسرے نمبر والی پاپا البتہ ایک ہی بات پوچھ رہی تھیں۔

”بلو تجھے کسی کی زیارت ہوئی، البتہ اللہ ر ملی۔“ بچے نے پہلے تو کھسیانوں کی طرح دیکھا پھر بڑی زوردار چٹکی قریب بیٹھے ایاز ماموں کو بڑی۔

”کسی کی زیارت ہوئی یا نہ ہوئی البتہ حیا ماما کے ارد گرد میں نے ڈھیر بچے دیکھے۔“ عمر ایاز کا منہ خوش ہونے کے بجائے بنویں کے ڈھیر سے بھر گیا تھا۔ دل نے چیخا کر کر کہا تھا۔

”مخموں! تم حیا کا رستہ چھوٹو گے تو وہ آئے گی۔“ ڈھیر تو خود ہی لگ جائے گا۔ ”وہ سب کی نظر بھا کر وہاں سے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ بڑی بھابھی کے منہ سے بڑی سے ”ہائے“ نکلی۔ سب ادھر ہی متوجہ ہوئے۔ بھائی جان کہہ رہے تھے۔

”بھئی اب مجھ میں ہمت نہیں۔ دیکھ کر لانا تھا۔“ دراصل کل چھوٹی نے بڑی بھابھی کو بتایا تھا کہ جوتوں کی بڑی سستی سیل گئی ہے، میں نے عید اور ایاز کی رخصتی کے لیے دو جوڑے لے لیے۔ سستی سیل کا سنتے ہی بڑی بھابھی کی بڑی بڑی آنکھیں چھوٹے سے منہ پر بہت تک حد تک پھیل گئیں۔ ہر چیز کی پروا کیے

بغیر۔ خرچے سے پیسے نکالے اور پہنچ گئیں اس سیل پر دھکم پیل میں جوتے کا سائز چھوٹا بڑا کیا تب تو محسوس نہ ہوا، سنبھل کر رکھ لیا تھا، لیکن اب بند کو دکھانے کے لیے آتے ہوئے ساتھ لے آئیں۔ انہیں تو شاید سستی کی بندھی پٹی میں اب بھی دکھائی نہ دیتا چھوٹی بند بول پڑی۔

”ارے بھابھی، تمہارے پاؤں چھوٹے بڑے کب سے ہو گئے۔“ تب جا کر غور سے دیکھا تو بین ڈالنے شروع کر دیے۔

”بچہ تو عید ہے اب کیا کپڑوں، دکھائیں تو پرسوں بھی بند ہوں گی ایاز کی بارات میں کیا نیکپاؤں جاؤں گی۔“ بھائی جان تو اسی وقت ہاتھ بھاڑ کر ایک طرف ہو گئے۔ ”دھیان سے لیتا تھا، ملے۔ سستی سن کر اندھ می کیوں ہوئی تھیں۔“ پھر عمر ایاز ہی تھا جو اس مشکل سے نکلتا ہے چارہ بار بار کہہ رہا تھا۔

”بھابھی سیل کی چیز واپس نہیں ہوتی۔“ مگر اس کی سننے کو نہ۔ بھابھی کی ایک سی رٹ ”تو جا کر اسے کہہ تو سنی، ان کا دوسرا جو نامی تو خراب ہوا ہو گا۔“ ”رٹ میں بھابھی وہ کھل سنیں گے۔“

”من میں گئے۔ تو جا کر تو دیکھ، اگر کم بخت نہ سنیں تو جوتے اٹھا اٹھا کر انہیں مارنے شروع کر دیتا۔ آپ ہی سنیں گے۔“

بھابھی نے اس کی ایک نہ سنی۔ جوتے تمہا کر اسے روانہ کیا۔ اب وہ کھل سیل والوں کے منہ لگ کر مزید وقت برباد کر رہا تھا۔ ان کے پورے جوتے کے سائز کا دوسرا جو تا خرید اور پہلے والا سڑک پر پھینک گھر آ گیا۔ ابھی جوتے بھابھی کو دیے تھے۔ سب بہن بھائی اپنے گھر چائیکے تھے سوائے بڑی بھابھی جو جوتے کے انتظار میں تھیں، پکڑتے ہی چلتی بنیں اور مصنفہ بہتا کہے۔ وہ جانے کیوں شکاری کی طرح کھات لگائے بیٹھی تھیں۔ عمر ایاز کا بایک رکتی ہی اس کی طرف دوڑی۔

”میری ایک بات سن۔“

”جی۔“ اس نے بایک پر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ ”بچہ اتنے بڑا ضروری کام ہے۔“

وہ نہ چاہتے ہوئے اتر اٹھا۔ ”کیا کام ہے اب۔“
رات ہونے کو آگئی۔“

”اوپر ہوتی ہوں۔ ایاز یہ ان بیچ کیا بلا ہے۔؟“
”آپ کو کیا کرتا ہے؟“ عمر ایاز کی ہنسنیں جیرانی سے
سمٹیں۔ بھلا پڑھی لکھی باتوں سے اس لپا کو کیا لیتا۔
رہتا۔

”کرنا کرانا کیا ہے۔ یہ آج کل کی رائٹرز کے دماغ
خراب ہو گئے ہیں، جاہلوں نے ان بیچ کر لکھنا سیکھ لیا،
اب میری جیسی فلم سے لکھنے والیوں کی تو آگئی میں
شامت تب ہی تو ان کی کہانیاں دھڑا دھڑکتی ہیں اور
میری جیسی کی کوئی بڑھنے کی زحمت نہ کرے۔“

اب وہ بے چارہ کیا بتاتا کہ باقی تمہارا لکھا تو تم خود
دوبارہ نہ پڑھ سکو بے چارے ادارے کا کیا قصور۔ اوپر
سے جس قسم کی بازاری زبان اور منظر نگاری کرتی
تھیں، تو وہ خود ڈرتا تھا کہیں غلطی سے پبلش نہ
ہو جائے، کیا ایسی تو ہے نہیں شہرت، ہضم کر لے،
ڈھول لے کر بینک ہی نہ پہنچ جائے، لوگوں سے کیسے
منہ چھپاؤں گا، یہ سب میری ہی بن نے لکھا ہے اور
ادارے والوں کا الگ آفس سنسر ہو جائے گا۔ وہ
بے چارہ کیا کانیا کھڑا سنتے خاموشی سے سر ہلاتا رہا، لیکن ان
کے اگلے جملوں نے ہلے سر کو بیک لگا دی۔

”میرے ذہن میں بہت ہی خوب صورت کہانی کا
پلاٹ کلپا رہا ہے تو ذرا دھر بیٹھ کر ان بیچ تو کروے، پھر
ای میل ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ عذاب لیب ٹاپ چلانا
بھی نہیں آتا، بن کوئی دباؤ، دب کوئی سا جاتا ہے اور
ایسی ایسی شرمناک چیزیں کھل جاتی ہیں۔“ کیا کوچ بیچ
شرم آگئی۔ یقیناً ”کچھ زیادہ ہی شرمناک دیکھ لیا تھا۔
”کیا کسی اور وقت کروں گا؟“ فی الحال وقت نہیں
ہے۔ ویسے بھی رات ہو گئی ہے۔“

”لے، تیرے کون سا بیوی بچے دور ہے ہیں فارغ
ہی اوھر اوھر پھرے گا۔ چل آجا میرا بھائی۔ دیکھ ایاز
اگر تو مجھے نہیں سکھائے گا تو پھر کس کے پاس جاؤں،
ہو سکتا ہے ای میل دیکھ کر اگلے جلدی جلدی پڑھ
لیں۔“

”لیکن میرا لیب ٹاپ تو گھر پر ہے کیا۔“ اس کے
دماغ نے بروقت کام کیا تھا۔

”ہاں تو بلو والے رکھ دے۔“
اسے زندگی میں پہلی بار بلوکے میٹرک کے نمبروں پر
افسوس ہوا تھا۔ نہ اچھے نمبر لیتا نہ حکومت کی طرف
سے بانٹے گئے لیب ٹاپ میں سے اسے بھی ملتا۔

کیوں کہ معبد بھائی تو جس قدر نجوس تھے، کیا بھی چار
پیسے بچا کر بیٹھ اپنے جوڑے ہی بناتی تھیں۔ خیر
مصنفہ کیا کہتے ساتھ اس کا کمزور سا بازو اپنے جاندار
ہاتھ میں دبوچ اور کھینچی بلوکے کمرے میں لے گئیں۔
کہانی لکھواتے منواتے اس بے چارے کے کتے کھٹے

بریلو کھڑے تھے۔ جانے کون کون سی فلمیں، انڈین
ڈرامے، گانے کس کر کے کہانی گھڑی جا رہی تھی اور ہر
جیلے پر اپنے آپ کو خود ہی داد دیتیں اور وہ حیرت سے
دیکھ رہا تھا۔ یہ سب خرافات میری بن کے منہ سے
اہل رہی ہے، اوھر بار بار حیا کے مسیح آرہے تھے۔

”آخر بتا کیوں نہیں دیتے؟ ناراض کیوں ہیں۔“ حیا
کو آج بیچ بیچ تشویش تھی۔ کیوں کے اس کے لپا کی
طبیعت کچھ خراب تھی۔ رمضان نے تھکا دیا تھا۔ اوپر
سے کل عید تھی۔ صبح کتنا چلنا تھا اور پھر دو دن بعد
بہی کی رحمتی بھی تھی۔ ان کی تھکاوٹ عمر لڑکوں کا تباہ
گالیاں دے دے کر اتر رہی تھی۔ آدھی رات کے بعد
وہ فارغ ہوا تھا، وہ بھی تب جب بڑی تپانے مصنفہ تپا کو
اچھا خاصا ڈانٹا۔

”اے کیا تو یوں ہی ٹنڈ منڈ بیٹھی رہے گی، کل عید
ہے۔ کوئی چوڑی، کوئی مندی، کچھ نہیں کرنا تجھے، کئی
ہے کہانیاں گھڑنے، لکھنی لگاتی تو ہیں نہیں۔“ اس
عزت افزائی پر تو شاید انہیں ذرا برابر اثر نہ ہوتا، ایسی تو
دن میں کئی بار ہوتی تھی، مگر تپا کا اگلا خیر سے بھر اچھا
انہیں کھسا گیا۔

”کیسے خیر ارادہ عید گاہ کے باہر بیٹھے کا تو نہیں ہے،
جو یوں حال بیکھرے بیٹھی ہے۔“ وہ پنچے جھاڑتی ہوئی
ایک لخت انہیں۔

”مانگیں میرے دشمن۔“ اشارہ بڑی تپا کی طرف

تھا۔ ”اللہ رکھے بڑی رقم ہے میرے پاس“ پارلوی نے تین بجے کا وقت دے رکھا ہے وہ تو میں ٹائم گزارنے کے لیے ایاز کو لیے بیٹھی تھی۔ ”حیرت سے آنکھیں منہ کھولے عمر ایاز کی دونوں چیزیں آپا کی جپٹے بند کیں۔

”چل اٹھ مجھے ذرا پارلر اتار کے آ۔ پھر کرتا رہ جو پڑھ کرنا ہے۔“

”اب کیا خاک کرتا ہے“ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ اللہ کرے پارلوی غلط کیسے کل اگلے اور منہ پر چھالے پڑ جائیں پھر فوراً ہی رخصتی ایٹ ہونے کا خیال گزر ا تو توبہ بھی کر ڈالی ورنہ یہ بسن تو ایسی تھی چاہے کتنیوں کی طرح وہائیں ڈال ڈال کر پانی بارات رکوا دیتی۔

اس نے حیا کی طرف جانے کا ارادہ عید کی نماز ادا کرنے پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ نیند آنکھوں سے دور کہیں حیا کے گھر جاسوگی تھی۔ ہر کوٹ کے ساتھ جملہ بھی بدل جاتا کہ وہ جیسے اسے منائے گا عید مبارک کے گا اسے عید کی دیتے کیسے تاثرات دیتا ہوں گے اور وہ شرابی بل کھاتی تھی ساری لگ کی۔ ان ہی سوچوں میں غلطی صبح ہو گئی تھی۔ گھر میں عید کی گھما گھمی تھی۔ وہ بہت اچھا سا تار ہوا تھا۔ نماز ادا کرنے کو نکل ہی رہا تھا جب حیا کی کل آئی۔

”عمر ایاز“ رمضان کی تھکاوٹ کی وجہ سے ایبا کی طبیعت بہت تاسا ہے، تمہیں آپ سے ایک ضروری مدد چاہیے کیا آپ وہ کر سکتے ہیں یا آپ کی خاموشی کو اجازت سمجھوں۔“

روزے اور وہ بھی مگری کے سب کو ہی شدید لمزوری ہو چکی تھی۔ لیکن وہ ہر بار ایبا کی تھکاوٹ کا ذکر کرتی اور کل تو یہ بھی بتایا تھا کہ آواز بہت بیٹھ گئی ہے ذرا سا بولنے پر گلا درد کر رہا ہے، اشادوں سے کام لے رہے ہیں اس نے جب یہی سوچا تھا۔ ٹھنڈے شربت، اہلی اتار دانے کی چٹنیوں نے شکایت پیدا کر دی۔ بھلا اپنی مریض کہتے، کھٹی ٹھنڈی چیزیں نہ کھاتے۔

”بتائیں“ آئیں گے یا نہیں۔ ”حیا کی کھٹکتی فرمائش نے سوچوں کا رگڑ کاڑ توڑا۔

”کیوں نہیں آئیں گے۔ بس میں آیا کہ آیا۔ اور ہلے وہ موقع نازتے ہی فوراً بولا۔“ آپ خفا مت ہوا کریں، بھلے میری جان کمزور سہی مگر اس میں بھی ایک دل ہے جو آپ کا نام لے لے کے دھڑکتا ہے۔ خدا را معصوفیات کی وجہ سے کوئی ہو جاتی ہے ورنہ میں تو سر کے بل۔“ وہ دوسرے قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”چلیں ٹھیک ہے عمر ایاز۔ ہمیں آپ کی محبت کا یقین آیا، مگر خدا کے واسطے سر کے بل چلنے والا کرب آپ بعد میں دکھاتے رہیے گا“ کافی الجھل اب اور اضنی کرنا ہے مہن کا کام کرویں۔“

”جی“ جی بندہ حاضر ہے۔“ اور پھر بندہ حاضری لگوانے اندر حیدر بانیگ دوڑا تا اس کے گھر جا کر ہی رکا تھا۔ ایبا مہن میں پہنچی چارپائی پر اٹھنے لپٹے تھے۔ بیگم کندھے کی بالش کر رہی تھیں۔ عمر ایاز کو دیکھتے ہی کل گئے۔ اپنی بیٹی آواز میں بولے۔

”بیگم مجھے پورا ایمین تھا میرا بچہ ضرور آئے گا“ آخر پورے رمضان میں نے لوگوں کو نیند سے جگا جگا کر روزے رکھوائے ہیں اللہ محنت ضائع نہیں کرتا۔“ وہ سلام کر کے بیٹھے لگا تھا۔ اپنے فوراً لگا۔

”اوہ بھائی اب بیٹھے کا وقت نہیں ہے بس میرے ساتھ ذرا سا کام تم بھی بیٹھا دو۔“

”ذرا میرے ساتھ مسجد چلے چلو فطرے کی پرچیاں کٹوانے۔“ ایاز کی ذرا کی ذرا آنکھیں پھیلیں اسے کچھ خاص سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اتنے میں انہوں نے حیا کو کھٹی آواز میں پکارا۔

”حیا! اندر سے ذرا پرچیاں تولے کر آ فطرے کے پیسے جمع کرنے آج میرا بچہ جائے گا۔ اس کی اندر کی سانس اندر باہر کی باہر ہو گئی۔ حیا اندر سے فطرانے کی پرچیاں لے آئی۔ اور بڑا الجھا کر بولی تھی۔

”ایبا کو منانے کا یہی طریقہ ہے۔ پلیز، میری خاطر۔“ اس کے اگلے وانت جڑ گئے۔ ناک پھولنے پچکنے لگی۔ اور دل دہائیاں دے رہا تھا۔

”اف اف شلوی“ لیکن جمل بسن بھائیوں کو منانے کے لیے اتنی خواری سہی دہل ایک ایبا جی اور سہی۔“